طالب حسین سیال

# اقبال کا تصور خیر و شر

اقبال کے نزدیک سرشت انسانی کی اصل شر نہیں ہے اور نہ ہی انسان کسی گناہ کی پاداش میں اس دنیا میں آیا ہے بلکہ انسان کی تخلیق سلیم فطرت پر کی گئی ہے اور اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خیر کا راستہ اختیار کر کے اپنی شخصیت کی تعمیر کرے اور چاہے تو شر کا راستہ اختیار کر کے اپنی شخصیت کی تحلیل کرے۔ اقبال کے اس تصور کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیات ہیں:

وَنَفْس وَّ مَاُ سَوّٰھا ، فَأَلْھَمَھَا فُجُورَھَا وَ تَقُو ھا ، قَدْ اَفْلَحَ مَنُ زَ کٰھَا ، وَقَدُ خَابَ مَنُ دَسّٰھا ، (۹۱:۷-۱۰)

ترجمہ: اور نفس انسانی کی اور اُس ذات کی قسم جس نے اُسے ہموار کیا۔ پھر اُس کی بدی اور اُس کی پرہیز گاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ، جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور نامراد ہوا وہ، جس نے اُس کو دبا دیا۔

اس کا مطلب یہ ہے انسان کا ضمیر اسے برائی سے آگاہ کر دیتا ہے لیکن یہ انسان کی اپنی کمزوری ہوتی ہے کہ وہ جانتے بوجھتے ہوئے برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اسلام انسانی ضمیر و وجدان کی گواہی کو سچ قرار دیتا ہے۔ مشہور حدیث ہے کہ گناہ وہ ہے جو تیرے دل میں کھٹکا پیدا کرے۔ انسانی ضمیر کی روشنی کا نہ صرف اسلام قائل ہے بلکہ دیگر مذاہب عالم بھی انسان کے ضمیر کے فیصلوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ کئی مفکرین انسان کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اس کی سرشت میں نیکی ہے اور اُس کے باطن کی آواز پر مبنی فیصلہ صحیح ہوتا ہے۔ مثلاً کانٹ (Kant) کا نقطۂ نظر بھی یہ ہے کہ:

انسان میں اخلاقی حاسّہ ہے، جس کی وجہ سے فطرتاً وہ نیکی کی طرف میلان رکھتا ہے۔ آزمائش و ابتلا کے وقت بھی یہ احساس قائم رہتا ہے کہ فلاں عمل غلط ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص آزمایش کا مقابلہ نہ کر سکے اور جھوٹ بولے لیکن وہ کبھی یہ نہیں چاہے گا کہ جھوٹ عالمگیر قانون بن جائے۔ کانٹ کے نزدیک نیکی کرنا امرِ غیر مشروط ہے۔ نیکی کرتے ہوئے انسان اپنے فرض کو نبھاتا ہے، اس لیے اس کو کسی صلہ کی تمنا نہیں کرنی چاہیے۔ انسان کو بلا خوف و خطر اور بلا حرص و آز اچھا کام کرنا چاہیے۔ نیکی کو صرف نیکی کی خاطر سرانجام دینا چاہیے[۱]۔

نیکی میں کوئی غرض پوشیدہ نہیں ہونی چاہیے۔ اقبال بھی انسانی شرافت کے قائل ہیں اور مسلم صوفیاء کی طرح اس مسلک کے حامی ہیں کہ انسان کو نیکی کرتے وقت کسی حور و قصور کی تمنا نہیں رکھنی چاہیے اور نہ اسے اللہ کی عبادت دوزخ کے ڈر کی وجہ سے کرنی چاہیے بلکہ عبادت الٰہی میں صرف خدا کی محبت کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ اقبال واعظ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

واعظ کمالِ ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے
سوداگری نہیں ، یہ عبادت خدا کی ہے!
اے بے خبر ! جزا کی تمنا بھی چھوڑ دے[۲]

اقبال خیر و شر کو نفس، شخصیت اور اسرارِ خودی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کی شخصیت جو ایک باشعور ہستی ہے اس کے باطن میں اپنی تعمیر اور تخریب کی قوتیں مضمر ہیں۔ وہ قرآنی قصۂ آدم سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

میری سوچ کا میلان اس طرف ہے کہ وہ جنت جس میں آدم کو رکھا گیا، ایک تصور ہے انسان کی ابتدائی حالت کا جس میں وہ عملی لحاظ سے اپنے ماحول سے منسلک نہیں تھا جس کی وجہ سے وہ انسانی آرزوؤں کی چبھن سے ناشنا تھا۔ انھی آرزوؤں کے پیدا ہونے سے انسانی ثقافت کی ابتدا ہوئی۔۔۔۔ پس ہم سمجھتے ہیں کہ ہبوطِ آدم کی تمثیل کا مقصد یہ بتانا مقصود نہیں ہے کہ اس کرہ ارض پر انسان پہلی دفعہ کیسے ظاہر ہوا بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے ارتقا کو واضح کیا جائے جو اس نے ابتدائی جبلتوں کی حالت سے شروع کیا اور آزاد اور باشعور ہستی کے مقام تک پہنچا۔ ایسی ہستی جو کہ شک کرنے اور نافرمانی کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ ہبوط کا مطلب کوئی اخلاقی گمراہی نہیں ہے۔ یہ انسان کا سادہ شعور سے ادراکِ ذات کی پہلی کوند کی طرف عبوری سفر تھا۔ اس طرح وہ اپنے باطن میں خوابِ فطرت سے بیدار ہوا اور سمجھ گیا کہ اُس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب کی ہے یعنی وہ مجبورِ محض نہیں بلکہ اسباب خود بھی تخلیق کر سکتا ہے۔ قرآن کے مطابق یہ زمین کوئی دارالعذاب نہیں جہاں بداصل انسان کو اُس کے بنیادی گناہ کی پاداش میں اسیر کر دیا گیا ہے۔ انسان کی پہلی نافرمانی اُس کے آزاد انتخاب کا پہلا عمل بھی تھا اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کے مطابق آدم کا یہ تجاوز معاف کر دیا گیا۔ اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ اچھائی اب کوئی امرِ مجبوری نہیں بلکہ یہ آزاد انسان کا اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اعلیٰ اخلاقی قدروں کے سامنے اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے مترادف ہے۔ ایک ایسی ہستی جس کی حرکات ایک مشین کی طرح لگی بندھی ہوں وہ اچھائی کی تخلیق نہیں کر سکتی۔ پس اچھائی کے لیے آزادی بنیادی شرط ہے[۳]۔

اقبال مادام بلوتسکی (Balvatski) کی کتاب (Secret Doctrine) کا حوالہ دیتے ہوئے مزید تشریح کرتے ہیں:

شجر، راز کی وہ علامت تھا جسے علومِ مخفیہ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ آدمؑ کو اس درخت کا پھل چکھنے سے

اس لیے منع کیا گیا کہ اس کی ذات، اُس کے حواس اور اس کی عقلی صلاحیتیں ایک مختلف قسم کے علم کے لیے موزوں تھیں۔ وہ علم جس میں صبر آزما مشاہدہ درکار ہوتا ہے اور جو بتدریج حاصل ہوتا ہے۔ شیطان نے آدم کو اس سری درخت کا پھل کھانے کی ترغیب دی اور آدمؑ آمادہ ہو گیا، اس لیے نہیں کہ شر اُس کی سرشت میں داخل ہے بلکہ اس لیے کہ وہ فطری طور پر جلد باز (عجولا) ہے۔ اس نے تحصیلِ علم کے لیے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا۔ اُس کے اِس رجحان کو درست کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ اسے ایک ایسے ماحول میں رکھا جائے جو اگرچہ تکلیف دہ ہو لیکن اس کی ذہنی صلاحیتوں کو بے نقاب کرنے کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ پس آدمؑ کو جسمانی لحاظ سے تکلیف دہ ماحول میں رکھنے سے مقصود اس کو سزا دینا نہ تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ انسان کے دشمن شیطان کو شکست دی جائے جس نے عیّاری سے انسان کو مسلسل نشو و نما اور پھیلاؤ کی لذت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کی۔ نفس متناہیہ کی زندگی کا متزاحم ماحول میں اس بات پر دارومدار ہے کہ وہ خود اپنے تجربات کی بدولت اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے اور اس متناہی خودی یعنی انسان کے سامنے سعی و عمل کے کئی امکانات کھلے ہیں جن کو وہ امتحان و آزمائش اور غلطی و خطا کے طریقوں سے طے کر سکتا ہے۔ آدمؑ کی غلطی جسے ہم ایک ذہنی برائی سے تعبیر کر سکتے ہیں، حصولِ تجربات کے لیے ناگزیر تھی[۴]۔

اقبال خیر و شر کو ایک کل سے تعبیر کرتے ہیں، اگرچہ وہ ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ وہ قرآن کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے:

وَنَبْلُوْكُمْ بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً

ترجمہ: ہم خیر و شر کے ذریعے آپ کو آزماتے ہیں۔ (۲۱:۳۵)

یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال خیر کی نشو و نما کے لیے شر کے وجود کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ابلیس کا وجود انسان کے تزکیہ اور اس کے کردار کی مضبوطی کے لیے ناگزیر تھا۔ اگر ابلیسی قوت نہ ہو تو انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں پروان نہیں چڑھ سکتیں اور انسان میں عزم و ہمت اور استقامت ایسی خصوصیات نہیں آ سکتیں۔ اقبال، جبریل اور ابلیس کے مکالمے کو اس طرح نظم کرتے ہیں:

جبریل پوچھتا ہے:

ہمدمِ دیرینہ! کیسا ہے جہانِ رنگ و بو؟

ابلیس جواب دیتا ہے:

سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو

جبریل کہتا ہے:

کھو دیئے انکار سے تو نے مقاماتِ بلند
چشمِ یزداں میں فرشتوں کی رہی کیا آبرو!

ابلیس جواباً کہتا ہے:

ہے میری جرأت سے مشتِ خاک میں ذوقِ نمو
میرے فتنے جامۂ عقل و خرد کا تار و پو!
دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزمِ خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے؟ میں کہ تو؟
میں کھٹکتا ہوں دلِ یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط ! اللہ ہو ، اللہ ہو، اللہ ہو![۵]

اقبال ہر اُس عمل کو خیر سمجھتے ہیں جو انسانی شخصیت کو تقویت پہنچاتا ہو اور جس سے انسانی خودی بیدار اور محفوظ ہوتی ہو اور ہر وہ عمل شر ہے جو انسانی شخصیت کو کمزور کرتا ہو اور جس سے انسانی خودی کو نقصان پہنچتا ہو۔ اپنے ایک مقالے میں اقبال نیکی اور بدی کی اس طرح وضاحت کرتے ہیں:

نیکی انسان کے احساسِ شخصیت کو ترقی دینے والی ہے اور بدی اس احساس کو کمزور کرتی ہے۔ پس نیکی ایک قوت، طاقت اور توانائی ہے۔ بدی ایک کمزوری ہے۔ انسان میں اس کی اپنی شخصیت کا ایک تیز احساس پیدا کر دو۔ اس کو خدا کی زمین میں بے خوف اور آزاد پھرنے دو۔ وہ دوسروں کی شخصیتوں کی عزت کرے گا اور بالکل نیک ہو جائے گا[۶]۔

اقبال اپنی بیاض میں لکھتے ہیں:

لہٰذا ہمیں چاہیے کہ فعلیت کی ان تمام صورتوں سے دست بردار ہو جائیں جو شخصیت کو تحلیل کرنے پر مائل ہوں مثلاً عجز و انکسار، قناعت، غلامانہ تابعداری وغیرہ۔ اس کے برخلاف بلند حوصلگی، اعلیٰ ظرفی، سخاوت اور اپنی روایات و قوت پر جائز فخر ایسی چیزیں ہیں جو شخصیت کے احساس کو مستحکم کرتی ہیں۔ شخصیت انسان کا عزیز ترین سرمایہ ہے، لہٰذا اسی کو خیرِ مطلق قرار دینا چاہیے اور اپنے تمام اعمال کی قدر و قیمت کو اسی معیار پر پرکھنا چاہیے۔ خوب وہ ہے جو شخصیت کے احساس کو بیدار رکھے اور ناخوب وہ ہے جو شخصیت کو دبائے اور بالآخر اسے ختم کر دینے کی طرف مائل ہو۔ اگر ہم وہ طرزِ زندگی اختیار کریں جس سے شخصیت کو تقویت پہنچے تو دراصل ہم موت کے برخلاف نبرد آزما ہیں۔ موت جس کی ضرب سے ہماری شخصیت کی اندرونی قوتوں کی ترتیب گڑبڑ ہو جاتی ہے۔ پس شخصیت کی بقاء ہمارے اپنے اختیار میں ہے، اس کے حصول کے لیے جدوجہد ضروری ہے۔ یہ خیال جو یہاں پیش کیا گیا ہے دوررس نتائج کا حامل ہے[۷]۔

جہاں خودی کا بھی ہے صاحبِ فراز و نشیب
یہاں بھی معرکہ آرا ہے خوب سے نا خوب
نمود جس کی فرازِ خودی سے ہو ، وہ جمیل
جو ہو نشیب میں پیدا ، قبیح و نامحبوب[۸]

اقبال کے نزدیک سرود و شعر اور کتاب و دین کا مقصد بھی خودی کی حفاظت کرتا ہے۔ اگر سیاست و دین اور فنونِ لطیفہ خودی کی حفاظت کرتے ہیں تو وہ سراسر خیر ہیں اور اگر وہ خودی کی حفاظت نہیں کرتے تو وہ شر

ہیں۔فرماتے ہیں:

سرود و شعر و سیاست ، کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں اُن کی گرہ میں تمام یک دانہ!
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ[9]

اقبال کے نزدیک انسانی شخصیت کوئی شے نہیں بلکہ ایک عمل ہے۔شخصیت کوئی جامد یا بنی بنائی چیز نہیں اور نہ یہ پہلے سے مقدر ہے۔شخصیت کوشش اور عمل سے بنتی بگڑتی اور تعمیر ہوتی ہے۔انسان جب کوئی نیک عمل کرتا ہے تو اس کا اس کی شخصیت پر اچھا اثر پڑتا ہے اور جب کوئی برا عمل کرتا ہے تو اس کی شخصیت پر برا اثر پڑتا ہے۔گویا اچھائی اور برائی کے اثرات سے مفر نہیں۔قرآن مجید نے اس حقیقت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے:

فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ خَیْراً یَرَہ ۰ وَ مَنْ یَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ شَرّاً یَّرَہ ۰ (۹۹:۷۔۸)
ترجمہ: اور جو کوئی ذرہ بھر نیک عمل کرتا ہے، وہ ضرور اسے دیکھے گا اور جو کوئی ذرہ بھر برا عمل کرتا ہے وہ اُسے ضرور دیکھے گا۔

انسان اپنے تخیلات اور تمنّیات اور عمل و افعال سے اپنی شخصیت کی ہر لحہ تخلیق کرتا رہتا ہے۔اگر اس کے ذہن میں برے خیالات آتے ہیں یا وہ اپنی جلد بازی کی وجہ سے کسی برائی کا مرتکب ہوتا ہے تو اُس کی شخصیت پر بُرے اثرات پڑتے ہیں۔جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے اقبال کے نزدیک شر انسان کی سرشت میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ اپنی طبیعت کی عجلت کے باعث شر کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔انسان جب کچھ سنتا ہے یا کوئی منظر دیکھتا ہے تو اُس کا فوری ردِعمل، جلد بازی کا ردِعمل ہوتا ہے لیکن اگر وہ تھوڑی دیر کے لیے توقف کرے اور سوچے تو اُس کا ردِعمل معقول ہو جاتا ہے۔گویا عجلت کا عمل حیوانی جبلت کا عمل ہے اور غور و فکر اور صبر و تحمل معقول عمل ہے اور یہی اصل انسانی رویہ ہے۔اِس انسانی رویے کو ہم حکمت سے تعبیر کر سکتے ہیں۔قرآن حکیم کے مطابق ''جس کو حکمت دی گئی اُسے خیرِ کثیر عطا کی گئی'' (۲۶۹:۲) انفرادی یا قومی سطح پر جو بھی فیصلہ عجلت میں کیا گیا ہو اور جو بھی قدم عجلت میں اٹھایا گیا ہو، وہ ہمیشہ غلط ہوتا ہے اور اُس کا انجام خیر نہیں ہوتا۔اس کے برعکس افراد یا اقوام جو بھی فیصلے غور و فکر اور باہمی مشاورت اور صبر آزما بحث و تمحیص کے بعد کرتے ہیں اور جو قدم کافی غور و خوض اور مشاورت کے بعد اٹھائے جاتے ہیں، وہ ہمیشہ اچھے نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔شیطان انسان کی فطرت کی اس عاجلانہ خاصیت سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اُس کے لیے شہوات کو مزیّن کر کے دکھاتا ہے، اس لیے انسان جذبات کی رو میں بہہ کر غلط قدم اٹھا لیتا ہے۔قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

زُیّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّھَوٰتِ مِّنَ النِسَآءِ وَالْبَنِیْنَ وَالْقَنَاطِیْرِ الْمُقَنْطَرَۃِ مِنَ الذَّھَبِ وَالفِضَّۃِ وَالْخَیْلِ الْمُسَوَّمَۃِ وَالْاَنْعامِ وَالْحَرْثُ ذٰلِکَ مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیا ۔(۱۴:۳)
ترجمہ: لوگوں کے لیے مرغوباتِ نفس ۔۔۔عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چند

گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں مگر یہ سب دنیاوی زندگی کا سامان ہے۔

حبِ نساء و بنین اور مال و دولت کی خواہش، مویشی اور زرعی زمین کی تمنا کوئی بری بات نہیں ہے لیکن ان خواہشات کو اخلاقی اقدار اور اصولِ اعتدال کا پابند کرنا لازم ہے۔ اقبال خواہشات کے استیصال کو خودی کی موت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک خواہش کی نفی، عزلت نشینی اور دنیا کو چھوڑ کر ویرانوں میں عبادت و ریاضت کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ انسان کی تخلیق کا مقصد رہبانیت اور فنائیت نہیں بلکہ آرزو ہی تو عینِ زندگی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است[۱۰]

کائنات کی ہر شے میں ذوقِ نمود ہے۔ آرزو ہی کی وجہ سے کائنات میں تخلیق کا عمل جاری و ساری ہے۔ کائنات میں ہر لحہ صدائے کن فیکون آ رہی ہے۔ نباتات سے لے کر انسانی دنیا تک، ہر ایک اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے لیکن انسان چونکہ علم رکھتا ہے اور باشعور ہے اس لیے وہ اپنی آرزوؤں کی تنظیم کرتا ہے۔ اپنے ارادوں اور اپنی خواہشات کو قواعد و ضوابط کا پابند کرتا ہے۔ انسان کی قوت اندھی قوت نہیں ہے بلکہ یہ قوت اخلاقی اقدار کی پابند ہے، اس لیے کہ انسان توانا ہونے کے ساتھ ساتھ دانا و بینا بھی ہے:

تسلیم کی خوگر ہے جو چیز ہے دنیا میں
انسان کی ہر قوت، سرگرم تقاضا ہے
چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستیِ دانا ہے، بینا ہے، توانا ہے[۱۱]

اقبال آرام و سکون اور تعطیل کو پسند نہیں کرتے بلکہ وہ اضطراب، مشکلات اور عمل پیہم کی راہ دکھاتے ہیں، اس لیے کہ زندگی میں مشکلات اور خطرات کے بغیر خیر کا حصول ناممکن ہے۔ خیر کی نشو و نما کے لیے کئی مشکل مرحلوں اور ابتلاؤں سے گذرنا پڑتا ہے۔ گوہرِ مقصود کے لیے دشت پیمائی کرنی پڑتی ہے اور خونِ جگر کو جلانا پڑتا ہے۔ شکست و ریخت اور سوز و کشید مصافِ زندگی میں ناگزیر مراحل ہیں۔ فرماتے ہیں:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی
حیات شعلہ مزاج و غیور و شور انگیز
سرشت اُس کی ہے مشکل کشی، جفا طلبی
مقام بست و شکست و فشار و سوز و کشید
میانِ قطرۂ نیساں و آتشِ عنبی[۱۲]

اقبال کی توجہ کا مرکز فرد ہے۔ فرد کی آزادی اور تعمیر و ترقی سے وہ معاشرے اور قوم کی آزادی و ترقی کی

طرف رجوع کرتے ہیں کیونکہ معاشرہ اور قوم افراد سے بنتے ہیں۔ اقبال کا نصب العین مضبوط اور توانا شخصیت ہے۔ یہ شخصیت خیر کی ترجمان، خیر کی نمائندہ اور خیر کی پرورش کرنے والی ہے۔ اس کے برعکس کمزور شخصیت شر کی طرف میلان رکھتی ہے اور وہ آسانی سے شیطان کے دھوکے میں آ جاتی ہے۔ شیطان برائی کو مزین کر کے دکھاتا ہے اور کمزور انسان ظاہری زیب و زینت دیکھ کر اور جلد ملنے والی منفعت یا لذت کی توقع میں برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اس کے برعکس مضبوط انسان میں خلفشار نہیں ہوتا۔ وہ حکمت اور تدبر سے کام لیتا ہے۔ اُس کی شخصیت کا استحکام اُسے شیطان کے حملوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ مضبوط ارادے والے انسان کو مشکلات پیش آ سکتی ہیں اور اُسے نیک رویے اور نیک اعمال کی وجہ سے صبر آزما کلفتوں سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ لیکن وہ ان ظاہری ناگواریوں سے نہیں گھبراتا اور ثابت قدم رہ کر کامیابی و کامرانی حاصل کرتا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے:

وَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئاً وَّ ھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَّعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئاً وَّ ھُوَ شَرٌ لَّکُمْ ۔ (۲:۲۱۶)

ترجمہ: اور ہوسکتا ہے تم ایک شے کو ناگوار سمجھو لیکن وہ تمہارے لیے خیر ہو۔ ہوسکتا ہے تم ایک شے کی محبت رکھتے ہو لیکن وہ تمہارے لیے شر ہو۔

ابلیس بھی اسی قسم کی مضبوط شخصیت رکھنے والے مردِ حق پرست سے شکست کھا کر لذت حاصل کرتا ہے اور وہ فرماں پذیر بندے سے پناہ مانگتا ہے۔

صید خود صیاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرماں پزیر

فطرتِ او خام و عزمِ او ضعیف
تا بہ یک ضربم نیارد ایں حریف

بندہ باید کہ پیچد گردنم
لرزہ اندازد نگاہش در تنم
اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست
لذتے شاید کہ یابم در شکست[۱۳]

اقبال کے نزدیک خیر صداقت، قوت اور روشنی ہے جبکہ شر ظلمت، اخلاقی پستی اور کمزوری ہے۔ شر ظاہری طور پر مزین ہوتا ہے۔ اُس کی قوت کھوکھلی اور عارضی ہوتی ہے۔ آزادی، غیرت و جسارت، نظم و ضبط، بلند حوصلگی، عزیمت، رواداری، خدمتِ خلق، فعالیت اور تخلیقی عمل خیر کے مظاہر ہیں۔ جن افراد اور اقوام میں یہ صلاحیتیں ہوں وہ خیر کے نمائندے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس غلامی و محکومی، توہم پرستی، بے عملی و عزلت نشینی،

دہشت گردی و بدنظمی استعماریت، تشدد پسندی و فرقہ واریت اور ہوسِ زر شر کے مظاہر ہیں۔ اقبال محکوم قوم کی فرماں پذیری اور گراوٹ کا اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
اُن کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام
آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام[۱۴]

اقبال زندہ قوموں کا یہ نشان بتاتے ہیں کہ وہ اپنے عقل و شعور اور مشاہدات و تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے نئے افکار کو جنم دیتی رہتی ہیں۔ اپنے مسائل کو حل کرتی ہیں اور انسانیت کو نئی راہوں سے روشناس کرتی ہیں۔

جہانِ تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آبجو سے کیے بحرِ بے کراں پیدا![۱۵]

اقبال انسان کو توہم پرستی، جہالت، ملوکیت اور اندھی تقلید سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کمزوریوں سے شرفِ انسانیت اور روشن ضمیری باقی نہیں رہتی۔ فرماتے ہیں:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری[۱۶]

اقبال فرد کی شخصیت کے حوالے سے فرد کی فروگذاشتوں سے صرفِ نظر کرتے ہیں بلکہ اُن کا خیال ہے کہ انسانی شخصیت میں غلطی و خطا اور تجربے کے ذریعے تادیبی عمل جاری رہتا ہے۔ جب انسان اپنی کسی خطا یا گناہ پر نادم ہوتا ہے تو اس کی شخصیت سے شر کے اثرات زائل کر دیے جاتے ہیں۔ اُس کا نفس لوامہ جب اسے ملامت کرتا ہے تو اس کی تعمیری قوتیں اور اس کی فطرت میں کارفرما خیر کے داعیات زیادہ سرگرم عمل ہو جاتے ہیں اور اُس کی شخصیت میں توبہ و اِنابت کی خصوصیت اللہ تعالیٰ کو بہت پسند آتی ہے اور وہ اُس کے درجات کو بلند کرتا ہے:

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے[۱۷]

اس کے برعکس اقبال قوموں کے گناہوں کے منطقی اثرات کو غیر متبدل سمجھتے ہیں، اس لیے کہ قوم نے شر پر اتفاق کر لیا ہے اور مجموعی لحاظ سے اُس کے اکثر افراد کا عمل ناخوب ہے، اس لیے اُس قوم کے لیے بربادی لازم ہے۔ قوموں کے عروج و زوال میں اُن کے اپنے اعمال کا دخل ہے۔ جب کسی قوم میں بگاڑ غالب آ جائے تو وہ قوم مٹ جاتی ہے یا محکوم ہو جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

اُس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف
فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف![۱۸]

اقبال خیر و شر کا نتیجہ دائمی سزا و جزا کو قرار نہیں دیتے اُن کا خیال ہے کہ ارتقائے شخصیت میں جزا و سزا مراحل ہیں۔ دوزخ تادیب کا ایک عمل ہے جس کا وجود عملِ اصلاح سرانجام دینے کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اللہ کی رحمت اُس کے غضب پر سبقت حاصل کر لے گی۔ "سبقت رحمتی علی غضبی"۔ اقبال کے ذہن میں وہ قرآنی آیات تھیں جن کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ کو ابدیت حاصل نہیں ہے جبکہ جنت کو ابدیت حاصل ہے۔ سورۃ تغابن ۶۴ کی آیت ۹ اور ۱۰ میں کہا گیا:

وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَ يَعْمَلْ صَالِحاً يُّكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيهَا اَبَدً ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۰ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنا اُولٰئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۰

ترجمہ اور جو شخص اللہ پر ایمان لا کر نیک عمل کرے، اللہ اُس سے اُس کی برائیاں دور کر دے گا اور اُسے جنت میں داخل کرے گا جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جن میں وہ ابدالآباد تک رہے گا۔ یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ سب جہنمی ہیں اور جہنم میں ہمیشہ رہیں گے (جب تک جہنم کا وجود ہوگا) وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

اِسی طرح سورۃ البیّنۃ میں بھی جہاں دوزخ کا ذکر ہے وہاں صرف خلدین فیھا کے الفاظ آئے ہیں۔ ابدیت صرف جنت کو حاصل ہے جہاں رحمتِ خداوندی کی نو بہ نو تجلیات کا ابدی اور لامتناہی سلسلہ ہوگا۔ اقبال نے قرآن حکیم کے اِس نکتے کو بیان کر کے بنی نوعِ انسان کو رجائیت اور خوشی کا پیغام دیا ہے۔ اقبال اپنے خطبے بعنوان ''خودی، جبر و قدر اور حیات بعد الموت'' میں کہتے ہیں:

قرآنی آیات میں دوزخ کے بارے میں لفظ ''خلود'' کا استعمال زمانی مدت کے معانی میں کیا گیا ہے۔۔۔ لہٰذا سیرت و کردار کی تبدیلی کے لیے بھی وقت کی ضرورت ہوگی۔۔۔ دوزخ دراصل تادیب کا ایک عمل ہے تاکہ جو خودی پتھر کی طرح سخت ہو گئی ہے، وہ پھر رحمتِ خداوندی کی نسیم جان فزا کا اثر قبول کر سکے۔ لہٰذا جنت بھی عیش و آرام اور تعطل کی کوئی حالت نہیں۔ زندگی ایک ہے اور مسلسل اور اس لیے انسان بھی اُس ذات لامتناہی کی نو بہ نو تجلیات کے لیے جس کی ہر لحظہ نئی شان ہے ہمیشہ آگے ہی بڑھتا رہے گا۔۔۔ خودی کی زندگی اختیار کی زندگی ہے جس کا ہر عمل ایک نیا موقع پیدا کرتا ہے اور یوں اپنی خلاقی اور ایجاد طباعی کے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتا ہے[۱۹]۔

اقبال انسان کو نائب خدا کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جس کا ایک طرف یہ فریضہ ہے کہ وہ فطرت کو مسخر

کرے اور دوسری طرف باہمی تعلقات میں احترامِ آدمیت کے اصول کو اختیار کرے۔ ان دونوں طریقوں سے انسان کی قوت اور اقتدار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کی خودی مضبوط ہوتی ہے اور وہ خالق حقیقی کے قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔ تسخیرِ فطرت کے ذریعے انسان نوامیس و قوانین فطرت کی آگہی حاصل کرتا ہے اور تخلیق کے رازوں سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک انداز ہے قربِ خداوندی کا۔ طبیعیاتی علوم میں ترقی کا نصب العین انسان کی آزادی اور اُس کی خوشحالی و بہتری ہونا چاہیے اور یہ تب ہی ممکن ہے جبکہ سائنسی ایجادات و اختراعات کو انسانی فلاح و بہبود کی خاطر استعمال کیا جائے۔ اگر سائنسی ترقیاں انسان کو مشین کا غلام کر دیں اور اُسے مادیت کا اسیر کر دیں تو اُس کا باطن روشن نہیں ہوتا۔ دوسری طرف جو قوم سعی و عمل سے غافل ہو جائے اور وہ تسخیرِ فطرت کے علوم سے بے بہرہ ہو، وہ کارگاہِ حیات میں بہت پیچھے رہ جاتی ہے بلکہ طاقتور قوموں کی غلام بن جاتی ہے۔ اقبال اس طرف اشارہ کرتے ہیں:

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور
خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر
قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام[۲۰]

اقبال انسان کو قوی اور نیک دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا پیغام کہ انسان ظاہری اور باطنی قوت حاصل کرے اور اسی طرح معاشرے بھی قوی ہوں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ آزادی، اچھائی کے لیے بنیادی شرط ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قوت کے حصول اور استعمال میں کیا اصول کارفرما ہونا چاہیے۔ اقبال ایک بنیادی اصول کی طرف ہماری رہنمائی کرتے ہیں اور وہ ہے احترامِ آدمیت کا اصول، جب انسان ایک دوسرے کے حقوق کا پاس کریں گے اور وہ بقائے باہمی پر یقین و عمل کر کے ایک عالمگیر برادری کی حیثیت سے آگے بڑھیں گے تو وہ خیر کے راستوں پر چل رہے ہوں گے۔ انسانی اخوت اور احترامِ انسان کے اصولوں پر عمل کر کے ابلیس کے ارادوں کو شکست دی جا سکتی ہے اور ان اصولوں ہی میں انسانیت کی بقا اور بھلائی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

> اعمال کی غایت نہ تو لطف و حظ ہے اور نہ کرب و درد۔ اعمال یا تو خودی کو سہارا دیتے ہیں یا خودی کی تحلیل باعث بنتے ہیں۔ یہ امر کہ خودی فنا ہو جائے گی یا اس کا کوئی مستقبل ہے، عمل پر موقوف ہے۔ خودی کو وہی اعمال برقرار رکھیں گے جن کی بناء اس اصول پر ہے کہ ہم بلا امتیازِ من و تو خودی کا احترام کریں۔[۲۱]

جاوید نامہ میں فرماتے ہیں:

حرفِ بد را بر لب آوردن خطاست
کافر و مومن ہمہ خلقِ خدا است!
آدمیت احترامِ آدمی
باخبر شو از مقامِ آدمی!

آدمی از ربط و ضبط تن بہ تن
بر طریقِ دوستی گامے بزن!
بندۂ عشق از خدا گیرد طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق![۲۲]

❁❁❁

## حواشی

۱۔ وِل ڈیورنٹ، داستانِ فلسفہ (مترجم، سید عابد علی عابد) فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۵۰، ۳۵۱۔
۲۔ ''کلیات اقبال، اردو (بانگ درا) اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۳۔
۳۔ محمد اقبال: The Reconstruction of Religious Thought شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۸۶۔۸۷
۴۔ ایضاً، ص ۸۶
۵۔ ''کلیات اقبال'' اردو (بال جبریل)، ص ۴۷۳۔
۶۔ محمد اقبال ''مقالات اقبال'' (مرتب: سید عبدالواحد) آئینہ ادب، ۱۹۸۸ء ص ۳۱۱۔
۷۔ محمد اقبال ''شذرات فکرِ اقبال'' (مترجم: افتخار احمد صدیقی) بزم اقبال، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۷۶۔۷۸۔
۸۔ ''کلیات اقبال'' اردو (ضربِ کلیم)، ص ۵۹۳۔
۹۔ ایضاً، ص ۶۱۲۔
۱۰۔ ''کلیات اقبال''، فارسی (اسرار و رموز) شیخ غلام علی، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۵۔
۱۱۔ ''کلیات اقبال'' اردو (بانگ درا)، ص ۱۹۰۔
۱۲۔ ایضاً، ص ۲۳۵۔
۱۳۔ ''کلیاتِ اقبال''، فارسی (جاوید نامہ)، ص ۷۲۵۔۷۲۶۔
۱۴۔ ''کلیاتِ اقبال'' اردو (ارمغان حجاز)، ص ۷۰۲۔
۱۵۔ ''کلیات اقبال'' اردو (ضربِ کلیم)، ص ۶۱۳۔
۱۶۔ ''کلیات اقبال'' اردو (ارمغان حجاز)، ۷۲۷۔

۱۷۔ ''باقیاتِ اقبال (مرتب: سید عبدالواحد معینی و محمد عبداللہ قریشی) آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۳۸۹۔

۱۸۔ ''کلیاتِ اقبال'' اردو (ضربِ کلیم)، ص ۵۹۹۔

۱۹۔ The Reconstruction of Religious Thought، ص ۱۹

۲۰۔ ''کلیاتِ اقبال'' اردو (ضربِ کلیم)، ص ۵۹۳۔۵۹۴

۲۱۔ The Reconstruction of Religious Thought، ص ۱۲۳

۲۲۔ ''کلیاتِ اقبال''، فارسی (جاوید نامہ)، ص ۷۹۳